اردو ناول کے ارتقا میں خدیجہ مستور کا حصہ بحوالہ ۔۔۔۔۔ زمین

سارہ طارق

ABSTRACT:

Khadija mastoor is an eminent novelist of progreesive era. She highlightes economic and social issues in her several short stories. She considerably added in the field of literature by writing novels as fame of "Angan" that occupies its own comprehensive status.

"Angan" and "Zamin" .She presents "Zamin" after the wide-spread After the partition of sub-continent novel writing was badly effected by the brutality and oppusion of that age.Nearly every author wrote on this great tragedy of bloodshed of the sub continent.It was a sound of agitation and protest which was raised by the writer community."Zameen" is an evident example of Khadija Mastoor's loyality with her mother land."Zameen" is presentation of such characters who are indulged hankering wealth in a disgraceful manners after forgetting their past.This novel is a good piece of satire on those people who wanted to be so- called respectable mark of society after hoalding money from different means.

Khadija Mastoor has critisized the ruler's outdated system.Her novel representes pakistani socio economic system,so it is a real proof of the art and technique of "Khadija Mastoor" prose writing.

۱۹۸۰ء کے بعد کا ناول نئے موضوعات، رجحانات اور نئے اسالیب کے اعتبار سے الگ اور منفرد کہلاتا ہے۔ اصلاحی ناولوں سے شروعات کرنے والا ناول ترقی پسند تحریک اور پھر فسادات کی لالی میں رنگ جانے کے بعد ۱۹۸۰ء میں اپنا مزاج بدل رہا تھا۔ تقسیم ہند نے خون کی لکیر سے سرحد بندی کی تھی۔ آقاؤں کے خون کا ایک قطرہ

بھی نہ بہا تھا اور غریب عوام کے خون کے دریا بہہ گئے تھے۔ ان سب حالات کا اثر سالوں تک لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتا رہا اور ان کو خون کے آنسو رلاتا رہا۔ جہاں حساس دل ان کی محبت میں تڑپے وہاں کم و بیش ہر ادیب نے اس عظیم سانحے پر قلم اٹھایا۔ فسادات نے سب کچھ راکھ کر دیا تھا۔ اس تقسیم نے آنکھوں کے آنسو ابھی خشک بھی نہ ہونے دیئے تھے کہ دوسری تقسیم کا آغاز ہوتا نظر آنے لگا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد لوگ مغربی پاکستان میں بس گئے جبکہ قابل لحاظ تعداد میں بیہاری مشرقی پاکستان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کوئی ملک نہ تھا۔ کوئی انہیں اپنا شہری ماننے کو تیار نہیں تھا۔ آخر تمام خدشات درست ثابت ہوئے۔ پاکستان کی سالمیت کو گہری چوٹ لگی اور بنگلہ دیش الگ وطن کے حوالے سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

پروفیسر محمد عارف لکھتے ہیں:

''سقوط ڈھاکہ یا دوسری تقسیم میں مسئلہ کفر اور اسلام کا نہیں مشرقی بنگالی اور غیر بنگالی کا تھا۔ فریقین کے گلے نعرہ تکبیرہ سے ہی کٹے تھے۔ سودارالاماں ہی دارالحرب ٹھہری۔''[۱]

مغربی پاکستان سے جو مشرقی پاکستان میں آئے تھے انہوں نے دیکھا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین ان کے لیے تنگ پڑھ گئی ہے اور مغربی پاکستان اب صرف پاکستان ہے۔ یہ تبدیلی صرف زمینی تبدیلی نہیں تھی بلکہ جذبات، احساسات، زندگیوں کے جذبوں کی تبدیلی تھی۔ اہل قلم نے اپنے قلم کی سیاہی میں جذبوں کی سچائیوں کی روشنی بکھیر دی۔ جہاں شعراء نے شاعری میں ان محسوسات کو واضح کیا وہاں ناول بھی ادیب اور سماج کے رویے کی اس تبدیلی کا اشاریہ تھا۔ جس کو ترقی پسند ناول نگاروں نے مستحکم کیا۔ ان ناول نگاروں نے ہجرت اور سقوط ڈھاکہ کے توبہ شکن واقعات کو اپنے ناول کا حصہ بنایا۔ علامتیت اور تشبیہاتی زبان میں اس تقسیم کے نتیجے کو تفصیل سے بیان کیا۔ معاشرے کی جنسی گھٹن، مڈل کلاس کی اخلاقیات کے پس پردہ پلنے والے کرداروں کو موضوع بنایا۔ ادب میں جنسی استحصال، عورتوں کو کمتر سمجھنا۔ مردوں کا دباؤ اور الجھنوں کو نہایت جرات کے ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے۔

جاگیرداری نظام کا سرمایہ داری نظام کی شکل میں دوبارہ جنم لینا ان ناول نگاروں کا اہم موضوع رہا ہے۔ نوابی دور کے خاتمے سے اور جاگیرداری نظام کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ان مصنفین نے کسانوں اور مزدوروں کی زندگیوں اور ان کے معاشی استحصال کو موضوع بنایا۔ غریب طبقے کی کسمپرسی، افلاس و غربت کی کہانیاں ان ناول نگاروں کے ناولوں کا حصہ بنیں۔ ایسا ادب تخلیق ہوا اور ایسے ناول وجود میں آئے جس نے تہذیبی سامراجیت کو علامتی پیرائے میں پیش کیا۔ طبقاتی نظام ان ناولوں کا خاص حصہ بنا۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں کسانوں کی جاگیردار مخالف جدوجہد کی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طبقاتی آویزش کی جھلک اردو ناول میں واضح دکھائی دیتی ہے۔

کچھ ایسے ناول نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے سرمایہ داری پر مبنی ناول لکھے۔ جاگیرداری کے خاتمے اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت کا رجحان اتنا بڑا کہ سرمایہ داری کو شدید فروغ ملا نئے صنعتی نظام نے جہاں لالچ، ناانصافی اور ہوس کو زیادہ عریاں شکل دی وہیں بدعنوانی، تنہائی، خودغرضی اور بے رحمی میں بھی اضافہ ہوا۔ سرمایہ

دار اور تاجر طبقے کی ہوس زر سے پیدا ہونے والی انسانی دشمنی کو ناول کا موضوع بنایا۔ اسی طرح اپنی جڑوں سے کٹے مہاجرین نے پاکستان میں قدم رکھتے ہی سماجی برتری حاصل کرنے کے لیے معاشی ذرائع کی لوٹ کھسوٹ اور کمزوروں کے حقوق غصب کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اس نو دولیتے طبقے کی ذہنی پراگندگی اور اخلاقی پستی کا یہ عالم کہ رشتہ دار رشتہ داروں کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہا تھا۔ نئے شہری معاشرے کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں ہونے والے عورت کے جنسی استحصال کے باعث پیدا ہونے والی اذیت کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ مردانہ ہوس، تحکم اور تسلط کے جال میں پھنسی بے بس عورت ان ناولوں میں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ اس معاشرتی ناداری اور ریاستی تشدد پسندی کے خلاف پاکستانی ادب میں مسلسل صدائے احتجاج بلند ہو رہی تھی۔ ان احتجاج بلند کرنے والے فنکاروں میں انور سجاد، شوکت صدیقی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نام ''خدیجہ مستور'' کا بھی ہے۔

غیاث الدین لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ نقطہ اتصال ہے جہاں پر غلامی ختم ہوتی ہے اور انسان آزادی کا سانس لیتا ہے۔ پرانا معاشرہ بدلتا ہے اور نئے لوگوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ہمارے ادب میں بھی نئے موضوعات اور نئے احساسات نے قدم رنجہ فرمایا۔ اس عظیم حادثے پر بڑے بڑے ناول بھی لکھے گئے۔''[۲]

خدیجہ مستور ترقی پسند تحریک کی ایک اہم ناول نگار ہیں۔ انہوں نے متعدد افسانے لکھے جن میں مختلف معاشی اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا۔ افسانوں کے علاوہ آنگن اور زمین جیسے اعلیٰ پائے کے ناول لکھ کر انہوں نے اردو ناول میں وقیع اضافہ کیا ہے۔ ''آنگن'' کی شہرت کے بعد خدیجہ مستور نے ''زمین'' نامی ناول پیش کیا۔ اپنی انفرادی حیثیت میں زمین ایک مکمل ناول ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

> ''جب تقسیم ملک کے موضوع پر آنگن جیسا بھرپور ناول لکھ لیا تو پھر خدیجہ مستور کو اسی موضوع پر نیا ناول لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کہیں یہ تو نہیں کہ آنگن لکھ لینے کے بعد خدیجہ مستور کے ذہن میں کوئی پھانس کھٹکتی رہ گئی ہو۔''[۳]

درحقیقت زمین کا تخلیقی محرک خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو بلحاظ موضوع اسے آنگن کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنگن کا قصہ جہاں ختم ہوتا ہے وہاں زمین کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ زمین کا آغاز مہاجرین کے کیمپ سے ہوتا ہے۔ ناول کا پہلا فقرہ ہی تقسیم کی اذیت کو پوری شدت سے ابھارتا ہے۔

> ''میری بیٹی، میری بیٹی، میری بیٹی کہاں ہے۔ بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیخا اور پھر اپنا سر جھکا لیا۔''[۴]

زمین کا مرکزی کردار ساجدہ ہے۔ ساجدہ جو ہجرت کر کے پاکستان آئی ہے کہ ایک نیا ملک اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے دکھوں کا مداوا کرے گا۔ وہ اپنے دکھ بھول کر دوسروں کے دکھوں پر آنسو بہاتی ہے۔ اپنے محبوب صلاح

الدین کا انتظار کرتی ہے جس نے ہجرت کرتے وقت کہا تھا کہ وہ اسے ڈھونڈھ نکالے گا۔لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا۔ ساجدہ کیمپ میں ہر دن اس کا انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کے اس کے باپ کا آخری سہارا بھی اسے اکیلا چھوڑ کر اپنی آخری ہجرت کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ باپ کا اچانک انتقال ساجدہ کو بے بنیاد بنا دیتا ہے۔ ایسے میں ناظم اسے سہارا دیتا ہے۔ ناظم جو دکھوں کی لو میں، حالات کی شکر دوپہر میں اور تپتی زمین پر ساجدہ کے لیے ایک گھنے سائے کی مانند ہے۔ صلاح الدین جو ساجدہ کے لیے ماضی استعارہ ہے اور اس کا نوستلجیا ہے۔ وہ اس کے لیے فردوس گمشدہ ہے جس کے بغیر اسے نئی زمین پر زندگی کا سفر بے لطف محسوس ہوتا ہے۔اس لیے جب ناظم شادی کی پیشکش کرتا ہے تو وہ کچھ دن انتظار کی مہلت مانگ کر ناظم سے شادی کر لیتی ہے۔

ناول کا ایک کردار ناظم کا بھائی کاظم ہے۔ یہ ہجرت کے بعد ایک کوٹھی کا تالہ توڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ وہاں پر رہائش پذیر ہو جاتا ہے۔ کاظم ایک ایسا کردار ہے جو کوٹھیوں کی جعلی الاٹ منٹ، زمینوں اور باغوں کی لوٹ مار کرتا ہے۔ وہ ڈپٹی کمشنر بن کر وطن عزیز پر اپنی جابرانہ حکومت مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ ناظم اور کاظم ایک ہی خاندان کے دو ایسے کردار ہیں جو نظام کی بدی اور بہتری کے آئینہ دار ہیں۔کاظم ہجرت کرنے والی لڑکیوں کو اپنا نوکر بنا کر رکھتا ہے اور ان کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔ ایسا ہی ایک کردار ''تاجی'' کا ہے وہ بھی ہجرت کر کے پاکستان آتی ہے تو پناہ کے لیے ناظم اسے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ جہاں وہ کاظم کی ہوس کا شکار بنتی ہے اور آخر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ دوسری طرف ناظم نظریاتی طور پر پاکستان کا حامی تھا۔ وہ اس کی ترقی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔تحریک آزادی کی پاداش میں وہ بار بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے یہاں تک کہ خود اس کا باپ جو ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے یہاں اتنا بڑا گھر، مال، پیسہ حاصل کرنے کے بعد بھی مزید کی ہوس اس کے اندر سر اٹھا رہی تھی۔ کاظم اور اس کا باپ درحقیقت ان لوگوں میں سے تھے جن کے نزدیک پیسہ ہی سب کچھ تھا۔ جب پاکستان بنانے کی تحریک چلی تو کاظم کا باپ ''مالک'' اور کاظم ہر وقت ناظم سے جھگڑتے کہ وہ اس تحریک میں حصہ ہی اس لیے لے رہا ہے تا کہ وہ خاندان کو بے گھر کر سکے ان کے نزدیک غریب کا مقصد حیات صرف یہ تھا کہ وہ جھونپڑیوں میں ذلت کی زندگی گزاریں۔ قربانیاں ناداروں نے دیں۔ دھن، دولت، عزت، جان و مال سب کچھ عوام نے پاکستان پر وار دیا۔لیکن پاکستان امیروں کا ہے:

> ''اصل مہاجر تو ہم لوگ ہیں۔ باقی رہے غریب غرباء تو وہاں بھی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ یہاں بھی خود ہی اپنی جگہ بنا لیں گے۔حکومت بھی دراصل ہمارے جیسے لوگوں کی آبادکاری کا نعرہ لگا رہی ہے۔''۵

تاجی جیسا ایک کردار ''لالی'' کا ہے۔ لالی کا باپ لالی کی شادی چار لڑکوں کے باپ سے کر دیتا ہے۔ یہ شخص اپنے بڑھاپے میں لالی جیسی جوان بیوی چاہتا ہے۔ لالی بتاتی ہے کہ اس کے باپ نے اس کی شادی آنا فانا کر دی تھی۔ لالی کے باپ نے اس کے شوہر کو آٹھ مربعے زمین دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن وعدہ وفا نہ ہونے پر اس کا شوہر لالی کو جی بھر کر مارتا اور مار کھانے کے بعد لالی ساجدہ کے پاس آ جاتی اور تازہ نیل دیکھ کر پہروں روتی ہے۔ لالی

کے باپ کا مقصد بھی صرف آخری بیٹی سے چھٹکارا پانا تھا۔ اس کی شادی کے چند روز بعد خود بھی جوان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔

یہ وہ نمائندہ کردار ہیں جو وطن عزیز کی ترقی کی بجائے اس کی شکست کا سبب بن رہے ہیں۔ ساجدہ کا محبوب صلاح الدین جس نے ساجدہ کو ڈھونڈ لینے کا وعدہ کیا تھا ناول کے اختتام میں دوبارہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ صلو جو ساجدہ کا محبوب تھا وہ کمشنر کاظم سے کوٹھی الاٹ کروانے آیا تھا۔ ساجدہ کو کاظم کی بھاوج جان کر بے حد خوش ہوتا ہے اور ساجدہ یہ سوچتی ہے کہ صلو کی باتیں ہی نہیں انداز بھی بدل گیا ہے۔ اپنی زمینوں کا رقبہ گنواتے اس کا سینہ کیسے فخر سے پھول گیا تھا۔ ساجدہ کو اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اپنے دل کی پرانی یادیں صلو کو دکھا سکتی۔

ہم عصر اردو ناول کے مصنفین لکھتے ہیں:

> ''''زمین'' ان کرداروں کو سامنے لاتا ہے جو نئے ملک میں بعد میں ابھرے اور آزادی کی تحریک کے دوران کے تمام آدرشوں کو بھول کر دولت سمیٹنے اور اپنے ماضی کو بھول کر چھچھورپن دکھانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ ناول ایک اچھا طنز ہے ان لوگوں پر جو تھے کچھ اور بنے کچھ اور۔''[۶]

ناظم اس نظام سے ملکی انتظام سے بددل ہو چکا تھا اس نے دیکھا کہ آزادی کے بعد بھی حکومت انہی جابر اور غاصب بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے۔ عوام علم و تشدد اور جبر و نا انصافی کا نشانہ بن رہی ہے۔ کوئی انقلاب نہیں آیا تھا۔ افسر شاہی وہی تھی۔ ظلم وہی تھا۔ وہ ناظم جو اس تباہی سے عاجز ہو کر محکمہ بحالیات کی نوکری چھوڑ آیا تھا۔ اپنے غاصب رشتوں کو چھوڑنے میں بھی ہچکچایا نہیں:

> ''ناظم نے اپنے کمشنر بھائی کاظم کو بھائی اور مالک کو باپ ماننے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ساجدہ نے صلاح الدین کا بت توڑ دیا اور وہ اس کا آدرش تھا۔ بچپن سے اس نے دل کے مندر میں یہ مورتی سجا رکھی تھی۔ جب اس نے اس بھگوان کو کاظم کے دربار میں سجدہ ریز دیکھا تو اس نے قبلہ درست کر لیا۔ تن من سے ناظم کو پیار کرنے لگی۔ لیکن اس پیار کی بنیاد ذاتی مفاد پر نہیں انقلابی فکر و عمل پر استوار تھی۔ عارضی طور پر ناظم تھک گیا ہے۔ وہ اس کے حوصلوں کو جوان رکھے گی۔''[۷]

یوں خدیجہ مستور نے اس فرسودہ نظام کو چلانے والے کرداروں کی بہترین عکاسی کی ہے۔ تمام کردار بھرپور طریقے سے پاکستانی نظام کی نمائندگی کرتے ہیں جو خدیجہ مستور کی ناول نگاری کا سب سے بڑا فن ہے۔

حوالہ جات:

(۱) محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۶۰۷
(۲) محمد غیاث الدین، فرقہ واریت اور اردو ناول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۶۰
(۳) سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۹
(۴) خدیجہ مستور، مجموعہ خدیجہ مستور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹۷
(۵) ایضاً ، ص ۵۲۶
(۶) قمر رئیس، علی احمد فاطمی (ترتیب وتدوین) ہم عصر اردو ناول، ایم۔آر پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۳۹
(۷) مجموعہ خدیجہ مستور، ص ۶۰۷